Volume 02, Issue 01 جنوری تا جون 2021

تحقیقی مجلہ تحقیق، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی فیصل آباد

CC BY

eISSN:2789-6331
pISSN:2789-4169

The novel "Gender" laments the disappearing civilization

ناول ''جندر'' مٹتی ہوئی تہذیب کا نوحہ

امجد خان، شعبہ اردو
جی ڈی سی نمبر ۲، مردان

Amjad Khan

Govt. Degree College No.02, Mardan

ABSTRACT

The novel under titled "*Jandar*" of Akhtar Raza Saleemi was published in 2017. It's a new addition to the fiction in Urdu literature. In this novel, the author highlighted the traditions and cultures of Khyber Pakhtunkhwa, especially of district Hazara. The author is mourning over the culture lag and by the vanishing of positive sanctions and standards in the cultures of these areas. Through this article, the author wants to convey the different aspects and the cultural pattern of these areas to the Urdu readers to preserve and promote it in a better way.

Key words: Akhtar raza saleemi, Novel, Tradition, Culture, Vanishing, Preserve, Promote.

جدیدیت، مابعد الجدیدیت، ساختیات اور پسِ ساختیات کی الجھنوں کو سلجھانے اور انہی نظریات کے تحت ادب تخلیق کرنے کے اس انتشاری دور میں اختر رضا سلیمی کا ناول ''جندر'' کسی اجتہاد سے کم نہیں ہے۔ انہوں نے عہدِ حاضر کی نظریاتی بھول بھلیوں میں گم ہونے کے بجائے خود کو اور اپنی مٹتی ہوئی تہذیب کو معدوم ہونے سے بچانے کے لیے قلمی جہاد کیا ہے۔ انہوں نے تہذیبِ نو کی رو میں بہنے اور اپنی اقدار و روایات اور رسم و رواج کو پامال کرنے والوں کو ناول کے انتساب ہی میں یہ کہہ کر جھنجھوڑا ہے:

ٹک دیکھ نہیں تو بہت افسوس رہے گا

ہم لوگ گزرتے ہوئے منظر کی طرح ہیں

تکنیکی اور ہیئتی نقطۂ نظر سے ''جندر'' علامتی ناول ہے، جسے لکھنے کے لیے سلیمی نے سادہ بیانیہ انداز اپنایا ہے اور اسلوب کو بھی حتی الوسع سادہ، سلیس اور عام فہم رکھنے کی کوشش کی ہے، اگرچہ ماضی کے واقعات اور کرداروں کو بیان کرنے کے لیے فلیش بیک اور سینما کی تکنیک سے استفادہ کیا گیا ہے، تاہم ناول کے موضوع کو بلیغ انداز میں پیش کرنے کے لیے مجموعی طور پر سادہ زبان و بیان اور ہیئت و تکنیک کو بروئے کار لایا گیا ہے، جو ناول نگار کے جذبات و احساسات اور تجربات و مشاہدات کو قاری کے دل و دماغ پر نقش کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس حوالے سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

> ''وہ سال میں دو ہی مرتبہ گاؤں آتا تھا؛ جون اور دسمبر میں: جب اس کے بچوں کے سکول بند ہوتے اور وہ خود دفتر سے چند دنوں کی رخصت لے لیتا۔ رخصت منظور ہوتے ہی وہ بیوی بچوں کو ساتھ لیتا اور آب و ہوا تبدیل کرنے یہاں آجاتا۔''(۱)

> ''ان دنوں ہمارے قریبی قصبے میں کتابوں کی ایک ہی دکان تھی، اس کے ہاں ہماری ضرورت اور دلچسپی کی کتابیں تو ایک حد تک دستیاب تھیں لیکن ان میں تراجم نہ ہونے کے برابر تھے۔ شروع شروع میں کتابیں خریدنے مجھے خود پنڈی جانا پڑتا تھا۔''(۲)

سلیمی کے پاس ایک پیغام ہے اور اسے ہر خاص و عام تک پہنچانے کے لیے انہوں نے وہی پیرائیہ اظہار اپنایا ہے، جو اس کے لیے موزوں تھا۔ دوسرے معنوں میں ان کا یہ انداز بھی جدیدیت سے روگردانی اور قدیم یا معدوم ہوتے ہوئے اسلوب یا طریقۂ

اظہار کو از سرِ نو زندہ کرنے کی سعی ہے، جس کے ساتھ ہمارے ملک اور خطے کے لوگوں کی ذہنی مطابقت رہی ہے۔ ایک عرصے سے وہ اس کے شناسا ہیں اور انہیں تفہیم کے عمل میں آسانی فراہم کرتے ہیں۔

"جندر" میں سلیمی ؔ نے اس تہذیب کی اقدار اور روایات اور رسوم و رواج کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی ہے، جو عمومی طور پر خیبر پختونخوا اور خصوصی طور پر ضلع ہزارہ کے دیہی علاقوں میں رائج رہی ہے اور بعض علاقوں میں اب بھی اس کی کچھ باقیات موجود ہیں، تاہم جدیدیت کے ہاتھوں وہ بھی معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔

اردو کی ادبی تاریخ میں پریم چند نے ہندستان کی دیہی زندگی کو پورے سیاق و سباق کے ساتھ پیش کیا ہے۔ احمد ندیم ؔقاسمی نے پاکستانی خطے پنجاب کے پسماندہ علاقوں کے مسائل و مصائب اور محبت و اپنائیت کے رویوں کو افسانوی ادب میں محفوظ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ فہمیدہ اختر اور طاہر آفریدی نے خیبر پختونخوا بالخصوص پشتون ثقافت و روایت کو اپنے افسانوں میں اجاگر کیا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تہذیب و ثقافت کی عکاسی ادب میں کوئی نیا اضافہ نہیں ہے، تاہم "جندر" کی مجموعی فضا اور اس میں پیش کی گئی تہذیب اردو دان طبقے کے لیے نادر اور انوکھی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے الفاظ میں:

> "اختر رضا سلیمی ؔ کا ناول "جندر" میں نے "سویرا" کے ایک شمارے میں پڑھا۔۔ کیا ہی انوکھا اور شاندار ناولٹ ہے۔"(۳)

جب کہ مسعود اشعر اس حوالے سے اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> "جندر بہت عمدہ ناول ہے اس کے ذریعے اختر رضا سلیمی ؔ نے اردو فکشن میں ایک نئے علاقے کو دریافت کیا ہے۔"(۴)

تہذیب و ثقافت یا اقدار و روایات کو تاریخ یا معاشرتی علوم میں بیان کرنا آسان ہوتا ہے لیکن ناول یا افسانے میں اس موضوع کو اس طرح برتنا کہ تہذیبی رویے بھی نمایاں ہو جائے اور کہانی کی ادبی ساکھ بھی برقرار رہے، خاصا مشکل ہے۔ اختر رضا سلیمی ؔ نے نہ صرف تہذیب و ادب کے امتزاج کا یہ مشکل کام کر دکھایا ہے، بلکہ تہذیب و ثقافت کی عکاسی کو وہ ناول کا وظیفہ گردانتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ناول تخلیق کرنے کا مقصد اپنی تہذیب کو زندہ رکھنا ہے۔ مجھے اپنی تہذیب کو پیش کرنے کے لیے ناول سے بہتر کوئی صنف نہیں ملی۔''(۵)

سلیمیٰ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے پانی سے چلنے والے ''جندر'' کو ہزارہ کے دیہات ''کیکوٹ'' کی ہزار سالہ تہذیب کی علامت بنا کر پیش کیا ہے اور اس کی اقدار وروایات اور رسوم ورواج کو ''جندر'' کے ساتھ اس فن کاری سے جوڑا ہے کہ جب تک ''جندر'' چلتا ہے اس وقت تک تہذیب کے رویے اور رجحانات بھی پھلتے پھولتے ہیں اور اس کے نمائندے بھی احساس ومروت، محبت واپنائیت اور امن وسکون کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں، لیکن جوں ہی بجلی سے چلنے والی آٹا مشینیں دیہات میں نصب ہو جاتی ہیں اور جندر پر چونگیں آنے کا سلسلہ تھم جاتا ہے، تو ''جندر'' کے متحرک پاٹوں کی سریلی گونج، درد بھری کوک میں تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ تمام رویے، اقدار، روایات، رسوم اور رواج معدوم ہونے لگتے ہیں، جنہوں نے اس تہذیب کے نمائندوں کو ایک دوسرے سے جوڑے رکھا تھا۔ ''جندر'' جب تک چلتا رہا، لوگ ایک دوسرے کی شادی بیاہ، کفن دفن اور معاشرتی سرگرمیوں میں شریک ہوتے رہے۔ ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹتے رہے اور خلوص ومحبت کے بندھنوں میں بندھے رہے۔ گھروں کی تعمیر میں وہ بلا معاوضہ ایک دوسرے کی مدد کرتے رہے۔ پہوچھی میں ہر گھر سے ایک فرد کی شرکت کو لازمی سمجھتے رہے۔ یہاں تک کہ فصلوں کی بوائی اور کٹائی بھی مشترکہ طور پہ ہوتی رہی۔ ذیل کے چند اقتباسات اس محبت پرور اور انسان دوست تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں:

''ان دنوں گھروں کی تعمیر میں بھی لوگ رضاکارانہ طور پہ حصہ لیتے۔ جب کوئی شخص نیا مکان بنانے کا منصوبہ بناتا گاؤں کے بیشتر لوگ اس میں بلا معاوضہ ہاتھ بٹانے آتے تھے۔''(۶)

''مکان کی تعمیر کا سب سے اہم مرحلہ جنگل سے بھاری کڑیاں اور بالے اٹھا کر لانا اور پھر چھت پر مٹی ڈالنا ہوتا تھا۔ کڑیاں لانے کے لیے لوگوں کی ایک پوری ٹولی جنگل کا رخ کرتی اور بھاری کڑی کے دونوں سروں پر کاہو کے مضبوط ڈنڈے باندھ کر چار آدمی اسے اٹھاتے اور چل پڑتے جوں ہی ان میں سے کوئی آدمی تھکتا کوئی دوسرا اپنا کندھا بڑھا دیتا اور پہلا کڑی کے نیچے سے ایک طرف سرک جاتا۔ مٹی ڈالنے کے عمل کو پہوچھی کہا جاتا تھا۔ پہوچھی میں گاؤں کے ہر گھر سے ایک آدمی ضرور شرکت کرتا۔''(۷)

”ان دنوں لیتریوں کے بغیر گاؤں کی زندگی کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ گاؤں کی تمام فصلوں اور گھاس وغیرہ کی کٹائی اور گاہی لیتری کی صورت میں مشترکہ طور پر ہوتی تھی۔ فصلیں تیار ہوتے ہی گاؤں کے تمام افراد مل کر گاؤں کے ایک سرے سے ان کی کٹائی بلا تفریق شروع کرتے، اور ہفتہ، دس دنوں میں پورے گاؤں کی فصلوں کا صفایا کر دیتے تھے۔“(۸)

سلیمیؔ نے اس چھوٹے سے ناول میں محض تہذیب کی عکاسی ہی نہیں کی، بلکہ قدیم و جدید تہذیب کی کشمکش کو بھی الفاظ کے روپ میں پیش کیا ہے۔ ناول کا راوی ”ولی خان“ تہذیبِ رفتہ کا پرستار ہے اور اس کے معدوم ہونے پر رنجیدگی کا اظہار کرتا ہے، جب کہ اس کا بیٹا ”راحیل“ تعلیمِ نو کا پروردہ، تہذیبِ نوی کی چکا چوند سے مرغوب اور اسے رائج کرنے کا خواہاں ہے۔

ولی خان ہر اس شخص کی نمائندگی کرتا ہے، جسے اپنے قدیم روایات سے بے پناہ محبت اور لگاؤ ہے۔ ولی خان کی مثال اس مچھلی کی سی ہے، جو قدامت کے سمندر میں رہ کر ہی زندہ رہ سکتی ہے۔ وہ جندر اور جندروئی تہذیب میں اتنا غرق ہو چکا ہوتا ہے کہ اسے جندر کی سریلی گونج کے بغیر نیند آتی ہے نہ وہ مطالعہ کر سکتا ہے اور نہ ہی وہ اس سے دور رہ سکتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کی تعلیم یافتہ استانی بیوی اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر شہر میں جا بستی ہے، جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ جدید تعلیم یافتہ اور قدامت پسند سیدھے سادے افراد کے درمیان ایک ایسی خلیج حائل ہو چکی ہے، جو انہیں ایک رشتے میں بندھے رہنے سے باز رکھتی ہے۔ اس حوالے سے راوی کا مندرجہ ذیل تجزیہ اہمیت کا بھی حامل ہے اور انسان کو سوچنے پر بھی مجبور کرتا ہے:

”ٹریکٹر اور اس سے وابستہ مشینوں نے آدمی کو پہلے زمین کی اور بالآخر آپس کی جڑت آزاد سے کر دیا۔ اب ہر آدمی آزاد اور خود مختار تھا۔۔۔ یہ خود مختاری غیر محسوس طریقے سے لوگوں کی رگوں میں دوڑنے لگی اور لوگ ایک دوسرے سے کٹتے چلے گئے۔ اگلے چند ہی سالوں میں شادی بیاہ اور ماتم وغیرہ کے لیے برتن بھی، جو پہلے گاؤں والوں کے گھروں سے اکھٹے کیے جاتے تھے، ٹینٹ سروس کی دکانوں سے آنے لگے اور قبریں مزدوری پر کھودی جانے لگیں۔“(۹)

ولی خان کا اپنا ہی خون راحیل، تعلیم و تہذیبِ نوی کا بادہ کش ہونے کے بعد اپنے باپ اور قدیم تہذیب دونوں کو موت کے گھاٹ اتارنے پہ تلا ہوا ہے۔ گھر کو گھر ہی کے چراغ سے آگ لگنے کے مصداق راحیل افسر بننے کے بعد پہلے باپ کو جندر چھوڑ کر اپنے ساتھ شہر لے جانے کی کوشش کرتا ہے، تاکہ افسروں میں اس کی ساکھ برقرار رہ سکے اور اسے اس شرمندگی سے چھٹکارا حاصل ہو سکے کہ اس کا باپ ایک جندروئی ہے، لیکن جب ولی خان انکار کرتا ہے، تو وہ گاؤں میں بجلی سے چلنے والی آٹا مشین نصب کر کے اپنے باپ کو جندر چھوڑنے پر مجبور کرتا ہے، لیکن اس کی یہ کوشش باپ کے ساتھ ساتھ پوری جندروئی تہذیب کو مٹانے کا باعث بن جاتی ہے۔ راوی کی زبانی سنیے:

> ”سات سال پہلے جب میرا بیٹا راحیل گاؤں کی مسجد کے خادم کو بجلی سے چلنے والی آٹا مشین لگانے کے لیے مالی معاونت فراہم کر رہا تھا تو اس کے سان گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ وہ ایک تہذیب کے انہدام میں حصہ ڈالنے کے ساتھ ساتھ، اپنے باپ کی موت کا بھی سامان کر رہا ہے۔“(۱۰)

آخر میں ولی خان اپنی اور نزع کے عالم میں دم توڑتی اس جندروئی تہذیب کا مرثیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”میرا یہاں اس طرح مرنا، صرف ایک انسان کی نہیں، ایک تہذیب کی موت ہے۔ وہ تہذیب جس کی بنیاد انسان نے ہزاروں سال پہلے اس وقت رکھی تھی جب دنیا کے پہلے انسان نے بہتے پانی کی وقت کا اندازہ لگایا تھا۔“(۱۱)

> ”شاید میری موت کو ابھی پندرہ بیس سال مزید تگ و دو کرنا پڑتی لیکن میرے بیٹے نے نہ صرف اس کا کام آسان بنا دیا بلکہ ایک تہذیب کے انہدام میں بھی اپنا حصہ ڈال دیا۔“(۱۲)

اس مختصر ناول کے ادبی قد کاٹ اور مقام کا تعین کرتے ہوئے بلال حسن بھٹی لکھتے ہیں:

> ”جندر ایک معدوم ہوتی ہوئی تہذیب کی کہانی ہے۔ ایک ایسی کہانی جس نے یقیناً اردو ادب کا مان بڑھایا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اگر یہ انگلش میں یا کسی اور زبان میں لکھی جاتی تو اب تک بڑے انعامات سمیٹ چکی ہوتی۔“(۱۳)

غرض سلیمیؔ نے جندر کے ذریعے اس عظیم تہذیب کو ادبی دستاویز کی صورت میں محفوظ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انہوں نے جیتے جی جندروئی تہذیب کو زندہ در گور کرنے کا ماتم کیا ہے اور پڑھنے والوں کو اس پر نوحہ کناں ہونے اور اسے از سرِ نو زندہ کرنے کا درس دیا ہے، تا کہ ہماری نوجوان نسل ایک بار پھر اپنے پرکھوں کی چھوڑی ہوئی وراثت اپنا کر امن و سکون اور بھائی چارے کی فضا میں سانس لے سکے۔

حوالہ جات

۱۔ اختر رضا سلیمیؔ جندر (اشاعتِ دوم) رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۸ء ص ۱۲

۲۔ اختر رضا سلیمیؔ جندر (اشاعتِ دوم) رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۸ء ص ۴۶

۳۔ مستنصر حسین تارڑ جندر (اشاعتِ دوم) بیک فلیپ رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۸ء

۴۔ مسعود اشعر جندر (اشاعتِ دوم) بیک فلیپ رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۸ء

۵۔ اختر رضا سلیمیؔ بہ حوالہ، اختر رضا سلیمیؔ کی ناول نگاری، تیمور اسلم، مقالہ برائے ایم اے اردو، غیر مطبوعہ، شعبۂ اردو، جامعہ آزاد جموں و کشمیر، مظفر آباد، ۲۰۱۹ء ص ۵۵

۶۔ اختر رضا سلیمیؔ جندر (اشاعتِ دوم) رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۸ء ص ۱۰۰

۷۔ اختر رضا سلیمیؔ جندر (اشاعتِ دوم) رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۸ء ص ۱۰۰

۸۔ اختر رضا سلیمیؔ جندر (اشاعتِ دوم) رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۸ء ص ۹۶

۹۔ اختر رضا سلیمیؔ جندر (اشاعتِ دوم) رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۸ء ص ۱۰۲

۱۰۔ اختر رضا سلیمیؔ جندر (اشاعتِ دوم) رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۸ء ص ۱۱۱

۱۱۔ اختر رضا سلیمیؔ جندر (اشاعتِ دوم) رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۸ء ص ۱۰۸

۱۲۔ اختر رضا سلیمی جندر (اشاعتِ دوم) رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۸ء ص ۱۰۷

۱۳۔ بلال حسن بھٹی بہ حوالہ، اختر رضا سلیمی کی ناول نگاری، تیمور اسلم، مقالہ برائے ایم اے اردو،
غیر مطبوعہ، شعبہ اردو، جامعہ آزاد جموں و کشمیر، مظفر آباد، ۲۰۱۹ء ص ۵۵